محقق اسلام علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم

کتب خانہ دارالعلوم حقانیہ
اکوڑہ خٹک
پاکستان

عالم کا نقطہ آغاز اور انجام ــــ ۶۰

مذہبی سوالات
اور
سائنس کی حد پرواز

> ”کیا سائنس فطرت انسانی کے مطالبات کا جواب دے سکتی ہے۔؟ ہم منتظر ہیں کہ سائنس یہ سب کچھ کر سکے کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعوؤں کی توثیق انہیں انکشافات اور سائنسی تحقیقات پر موقوف ہے ــــــــ“

مذہب کے اس بنیادی سوال (عالم کا نقطہ آغاز اور انجام) کو سائنس حل کر سکتی ہے یا نہیں، اس کے لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سائنس کی حد پرواز کیا ہے، علماء سائنس نے اس علم کے حدود کو معین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

”سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمامتر فطرت کے ان واقعات اور مشاہدات سے ہے جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدہ کے دائرہ سے خارج ہیں، سائنس کو ان کے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔“

ماہرین سائنس کا اعتراف پروفیسر لیتر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس ہے، لکھتا ہے:

”کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں، جسطرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں، ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ رہتا ہے۔“

پروفیسر ٹنڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے:

”اگر تم گھڑی کو دیکھو اس میں گھنٹے منٹ سکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں

پھرتی ہیں اور ان کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے، کیونکر قائم ہے، ان سوالات کا جواب بے گھڑی کے کھولے اور اس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور ان کا دوسروں سے تعلق قائم کئے بغیر نہیں دیا جا سکتا ہے، جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے، لیکن بجنسہٖ یہی حال واقعات وحوادث فطرت کا ہے، عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے اور ایک خزانۂ قوت ہے جو اس مشین کو چلا رہا ہے، سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرۂ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات وحوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں لیکن کارخانۂ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے، اور کیسے بنی اور اس گھڑی کو کس نے کوکا اور اس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی، یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تحقیق و ایجاد پر وہ قادر نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی توانین کو ایجاد کرتی ہے، نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہے بلکہ حوادث وواقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کیساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے دائرہ احساس ومشاہدہ میں آ جاتے ہیں، مثلاً وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے، وہ اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشنا، تخلیق کردن) نہیں کرتی، بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے تو یہ ایک قدرتی قانون ہے۔ کہ وہ بھاپ بن جائے، بہرحال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بنا نہیں سکتے بلکہ صرف جان سکتے ہیں، اور سائنس اس پر اتنا اور اضافہ کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتے ہیں جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا، لیکن یہ سوال کہ ان قوانین کا مقنن کون ہے، ان کا نقطۂ آغاز کیا ہے اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا، سائنس کے حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔

ہکسلے نے سائنس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ:

"وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہ نہیں کر سکتی اس کے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے جا سکتے کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ بھی توجیہ میں آغاز اشیاء کی جانب چند

قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

حکیم اور عامی میں فرق

بہرحال انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطۂ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کل نہیں بلکہ فطرت کے صرف اُن قوانین کو وہ جان سکتا ہے جو جو اس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت تک عام انسانی پرواز ختم ہو جاتی ہے. تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا۔؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے، اور حکیم بھی اس دائرہ کے آگے قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کے اثرات کو دور تک نہیں لے جا سکتا، یعنی ایک جزئی واقعہ سے کلیہ نہیں بنا سکتا اور حکیم ایک جزئی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے، اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزیہ تک محدود ہے یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے، پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزیہ کو وہ کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے، اور اسی کو قانون کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے، لیکن وہ چونکا کہ آخر کیوں گرتا ہے اس کو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا بالآخر اس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کرے تیر رہے ہیں وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال نیوٹن نے فضائی کروں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کروں کا موجد تھا، یا اس نے اُن میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کر دی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا صرف اس کا علم اس نے حاصل کیا اس سے زیادہ نہ اس نے کچھ کیا اور نہ کر سکتا تھا وہ خود کہتا ہے۔

"عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادہ کے سوا اور کسی شئے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے۔"

اور یہی حال سائنس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے، بھاپ سے کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں جس طرح اسٹیفن نے دیکھا، لیکن اسٹیفن نے اس جزئی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین مثلاً لوہے کی لچک پہیوں کی گردش اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کر دیا اس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے جسے ہم ٹرین کہتے ہیں۔

الغرض صنعت و حرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں

لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی بات نہیں وہ نقطہ "علم آدم الاسما کلھا۔ (سکھایا اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کر سکتا ہے اور یہی اسے دیا بھی گیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے حدود الحاصل جب سائنس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہو جاتا ہے تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قائم ہے، مثلاً عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے۔؟ جیسا کہ ہکسلے نے کہا تھا کہ سائنس کا قدم آغاز اشیاء کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطہ تک اس کی رسائی کیونکر ہو سکتی ہے۔

پس سچ یہ ہے کہ سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتی ہے، مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائنس صرف عالم شہادت (عالم محسوس) کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنے بازو ڈال دیتی ہے محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے، اور مذہب انسان کا وہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتداء کیونکر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے ـــــ انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے، اور اس پر کیا گزرتی ہے۔؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے، دنیا کا آخری انجام کیا ہو گا۔؟ سائنس متحیر ہے کہ اس کا کیا جواب دے، مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے۔

سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لئے ہے، لیکن خود انسان کس لئے ہے اس مقصد کو متعین کرنے سے وہ عاجز ہے، مذہب آتا ہے اور اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیتا ہے، الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے، سائنس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہو جاتا ہے، میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ:

> "عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا کہ یہ محض بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ (بحوالہ الکلام مولانا شبلی)

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائنس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی" جیسا کہ گیزو نے غایت گستاخی کیساتھ لکھا ہے کہ:

> "ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔"

(نعوذ باللہ تعالیٰ شانہٗ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔ کسی؎ نے خوب کہا ہے کہ:

(؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

"اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کے حدود جدا جدا ہیں ایک کی تگ و دو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا غیبی فضا کا شہباز ہے تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ حافظ شیرازیؒ سچ فرماتے ہیں ؎

عاقلاں نقطۂ پرکار وجود اند و لے   عشق داند کہ دریں بادیہ سرگردانند

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ہم سائنس کے ذریعہ آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں، آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ احیاء[۲] موتیٰ۔ (مُردے کو

---

[۱] میری مراد مولانا عبدالباری ندوی پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ سے ہے۔ مولانا نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ سورت میں ایک مقالہ "دینیات اور عقلیات" کے عنوان سے پڑھا تھا یہ رسالہ کانفرنس کی طرف سے شائع بھی کر دیا گیا ہے، ارباب تحقیق نے باوجود اختصار کے اس مقالہ کی کافی ستائش کی، حضرت مولانا تھانوی نے دین و دنیا کے درمیان سدِّ آہنی اسی رسالہ کو قرار دیا ہے، خاکسار نے بھی اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں مولانا کے اس مقالہ سے کافی نفع اٹھایا ہے۔ بلکہ مغربی مصنفین کے اقوال جو اس حصہ میں درج ہیں، ان کی معقول تعداد مولانا ہی کے مضمون سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲ منہ

[۲] دجّال کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے کہ منجملہ اور باتوں کے وہ مردے کو بھی زندہ کرے گا، حدیثوں کا صحیح ذخیرہ دجّال کی اس خصوصیت کے ذکر سے معمور ہے بلکہ دجّال کی یہ خصوصیت کہ چالیس دن کی مختصر مدت میں کرۂ زمین کے شمال و جنوب مشرق و مغرب کی ہر آبادی میں پہنچ جائیگا۔ یعنی بعد مسافت کے مسئلہ کو گویا درجہ صفر تک پہنچا دے گا۔ یا مون سون پر قابو یافتہ ہو کر جہاں چاہے گا پانی برسائے گا۔ آپ اگر غور کریں گے تو سائنس کے رجحانات ان چیزوں کی تکمیل کی طرف ہیں۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بُعد مسافت کی کمی کے سوا اور کیا ہے۔ بارش برسانے کی جدوجہد بھی سنا جاتا ہے کہ سائنس کی دنیا میں جاری ہے۔ پھر کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ سائنس کا انتہائی عروج ممکن ہے کہ دجّال ہی کے ہاتھوں پر مقدر ہو۔

زندہ کر دینے) پر بھی آدمی قادر ہو جائے گا، بلکہ زندہ کرے گا، دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ :

"انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا۔"

اور سائنس والوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے "تخم حیات" (پروٹوپلازم) کا پتہ چلا لیا ہے، کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخم حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے ـــــــ تو سائنس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم منتظر ہیں کہ وہ ایسا کرے کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعوؤں کی توثیق انہیں انکشافات پر موقوف ہے، لیکن با ایں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اسی طرح عاجز رہے گی جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے، فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا کر بھی لیا تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے ٹھیک اسکی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانہ میں یوں حل کیا گیا تھا کہ نر و مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے۔ لیکن اس وقت بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں پیدا ہوتا ہے، اب بھی یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔؟ کیا جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے کیا اس نے اس سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیونکر پیدا ہوتا ہے۔؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفاسٹ کے لکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کہی کہ :

"لیکن کیوں۔؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیئے اسی طرح ناممکن رہے گا جس طرح کہ پہلے رہا ہے۔"

امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

الحاصل کسی شئے کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے، آئندہ کیا ہوگا، موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا، اس کے آثار و نتائج کیا ہوں گے۔؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی، وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اقرار کیا تھا، اب انجام کے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے :

"عالم تو بڑی چیز ہے، سائنس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا، اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے، لیکن ہمیشہ کیا یہی ضرور ہوگا۔"

اس کے نزدیک یہ قانونِ قدرت نہیں بلکہ انسان کا وہمی اضافہ ہے اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو تو یہ ہمارے واہمہ کا ایک گھڑا ہوا بھوت ہے سائنس ہی کا یہ قانون ہے کہ پتھر جب بے سہارا ہوگا تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا یعنی اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زائد شئے کا اضافہ ہے جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اور سے اس کا پتہ چلتا ہے۔"

—— یعنی یہ ایسا حکم ہے جسکی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔

سائنس کی یہ رائے تو انجام سے متعلق تھی، رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کئے ہیں، لیکن آخر میں ہکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں —— وہ اپنی کتاب "اصول و نتائج" میں لکھتا ہے:

"وجود کی علّت اولیٰ کا مسئلہ میرے حقیر قوٰی کی دسترس سے باہر ہے۔ جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں جو آغازِ عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں، مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔"

تفسیر روح المعانی (عربی) از علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رح، ہمارے ہاں زیر طبع ہے۔ طباعت عمدہ ٹائپ۔ کاغذ امپٹیشن آرٹ ہدیہ -/۳۰۰ روپے۔ کاغذ سفید گلیز ہدیہ -/۲۵۰ روپے ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ تک -/۲۰ روپے پیشگی جمع کرانے پر امپٹیشن آرٹ -/۲۵۰، سفید گلیز -/۲۰۰ روپے میں دی جائے گی۔ بعجلت ممکنہ اسے مکمل کیا جائیگا۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

مکتبہ امدادیہ۔ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان۔ پاکستان۔